ریاستی پالیسی میں اسلاموفوبیا کا نفوذ: اسباب و محرکات کا جائزہ

The Infiltration of Islamophobia Into State Policies: A Critical Analysis of Underlying Causes and Driving Factors

Syeda Shumaila Rubab Rizvi
PhD Scholar, Department of Quran and Sunnah,
University of Karachi
Email: shumaila.rubab@salu.edu.pk

Abstract

This research paper critically examines the infiltration of Islamophobia into state policies, highlighting its structural causes and ideological drivers. It explores how legal frameworks and legislative processes have been utilized to institutionalize religious discrimination under the guise of national security and counter-terrorism. By analyzing parliamentary debates, election campaigns, and political manifestos, the study identifies the organizational structures through which Islamophobic narratives are embedded in state institutions. Furthermore, the research investigates the psychological and sociological impacts of Islamophobia-based legislation on Muslim communities, including issues of marginalization, identity crisis, and political disenfranchisement.

Employing a multidisciplinary approach that draws from political science, sociology, and media studies, the paper theorizes the transformation of Islamophobia from a societal prejudice into a normalized component of statecraft. It argues that this phenomenon is not merely reactive but strategically driven by electoral politics, ideological positioning, and security paradigms. The study ultimately calls for a critical reassessment of policy frameworks and advocates for inclusive governance models that resist the institutionalization of religious biases, aiming to protect democratic values and social cohesion in increasingly pluralistic societies.

Keywords: State Islamophobia, Legislative Discrimination, National Security Narratives, Political Islamophobia, Counter-Terrorism Policies, Muslim Marginalization, Institutionalized Prejudice

تعارف

اسلاموفوبیا محض سماجی رویوں اور میڈیا پر پیش کیے جانے والے بیانیوں تک محدود نہیں رہا بلکہ اب ریاستی پالیسیوں میں بھی اس کا واضح نفوذ دیکھا جا سکتا ہے۔ اس تحقیق کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ ریاستی پالیسی میں اسلاموفوبیا

کے سرایت کرنے کے اسباب و محرکات کا تنقیدی تجزیہ کیا جائے۔ موجودہ دور میں کئی مغربی ریاستوں میں ایسی قانون سازی، سیاسی بیانات، انتخابی مہمات اور حکومتی پالیسیز سامنے آئی ہیں جو براہ راست یا بالواسطہ مسلمانوں کو ہدف بناتی ہیں۔ قانون سازی کے پردے میں مذہبی امتیاز کا یہ رجحان نہ صرف آئینی مساوات اور شہری آزادیوں کو چیلنج کرتا ہے بلکہ معاشرتی تقسیم کو بھی مزید گہرا کرتا ہے۔

تحقیق میں پارلیمانی بیانات، انتخابی منشورات اور سیاسی جماعتوں کی پالیسی دستاویزات کا تجزیہ کرتے ہوئے اسلاموفوبیا کی تنظیمی اور ساختی نوعیت کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ قومی سلامتی اور انسدادِ دہشت گردی کے نام پر وضع کی گئی پالیسیوں کے نفسیاتی و عمرانیاتی اثرات کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ یہ مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ کس طرح "قومی سلامتی" کے بیانیے کو استعمال کرتے ہوئے مسلمانوں کو مشتبہ گروہ کے طور پر پیش کیا گیا اور ان کے سماجی و سیاسی حقوق کو محدود کرنے کی راہ ہموار کی گئی۔ اس تحقیق میں اسلاموفوبیا کو محض ایک سماجی عصبیت کی بجائے ایک ریاستی نظریے کے طور پر دیکھا گیا ہے۔

ریاستی اسلاموفوبیا: قانون سازی کے پردے میں مذہبی امتیاز

اسلاموفوبیا جب ریاستی اداروں، پارلیمانوں اور قانون ساز حلقوں میں داخل ہو جائے تو وہ محض ایک سماجی رویہ نہیں رہتا بلکہ ایک باقاعدہ قانونی فریم ورک اختیار کر لیتا ہے، جو پوری قوم کی سمت اور شناخت پر اثر انداز ہوتا ہے۔ مغربی دنیا میں اسلاموفوبیا کی موجودہ صورت صرف عوامی سطح پر تعصب تک محدود نہیں رہی، بلکہ اس نے باقاعدہ ریاستی پالیسیوں، عدالتی فیصلوں، قانون سازی اور آئینی اصلاحات کا لبادہ اوڑھ لیا ہے۔ یورپ اور شمالی امریکہ میں ایسے درجنوں قوانین موجود ہیں جو بظاہر "سیکولر"، "سیکیورٹی پر مبنی" یا "جمہوری اصولوں" کے تحت نافذ کیے گئے، لیکن درحقیقت ان کا ہدف مسلمان اقلیتیں، ان کی مذہبی علامات، اور ان کا معاشرتی انضمام ہے۔

فرانس اس رویے کی ایک نمایاں مثال ہے۔ وہاں 2004 میں نافذ ہونے والا قانون جس کے تحت سرکاری اسکولوں میں "نمایاں مذہبی علامات" پر پابندی عائد کی گئی، دراصل مسلم لڑکیوں کے اسکارف پر پابندی کے لیے تھا۔ فرانس کی قومی اسمبلی نے اس قانون کو "Laïcité" یعنی سیکولرزم کے تحفظ کے طور پر پیش کیا، مگر اس قانون کا اطلاق عملاً صرف مسلمانوں پر ہوا۔ اسی نوعیت کا دوسرا قانون 2010 میں منظور ہوا، جس میں عوامی مقامات پر برقع یا نقاب پر مکمل پابندی عائد کر دی گئی۔ فرانسیسی حکومت نے اسے خواتین کی آزادی اور قومی شناخت کے تحفظ کا نام دیا، لیکن مسلم خواتین کو اس قانون کے بعد نہ صرف عوامی مقامات میں حجاب ترک کرنے پر مجبور کیا گیا بلکہ ہزاروں خواتین تعلیمی و معاشی میدان سے نکلنے پر مجبور ہو گئیں۔

یورپی عدالت برائے انسانی حقوق (European Court of Human Rights) نے جب S.A.S. v. France(2014) کیس میں برقع پر پابندی کو جائز قرار دیا، تو یہ فیصلہ اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ اسلاموفوبیا صرف عوامی سطح پر موجود نہیں بلکہ عدالتی سطح پر بھی اس کی قانونی توثیق کی جارہی ہے۔ فیصلے میں لکھا گیا کہ:

"The ban pursues legitimate aims, such as the preservation of the conditions of 'living together' and the protection of the rights and freedoms of others[1]".

یہ فیصلہ اس بات کا اشارہ ہے کہ مسلمان شناخت کو عوامی معاشرے میں جگہ دینا اب ایک "غیر معمولی رعایت" شمار ہونے لگا ہے، نہ کہ ایک شہری حق۔ مندرجہ بالا گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ جب ریاستی ادارے مذہبی علامات کو "سیکولر اقدار" کے منافی قرار دیں، تو مذہب محض نجی معاملہ بن کر رہ جاتا ہے، اور اسلامی شعائر کو پوشیدہ رکھنا شہری ذمہ داری بن جاتی ہے۔

اسی طرح آسٹریا نے 2017 میں ایک قانون منظور کیا جسے "Integration Law" کہا گیا۔ اس قانون کے تحت تمام عوامی خدمات، دفاتر، اسکولز، اور صحت مراکز میں چہرہ ڈھانپنے پر پابندی عائد کی گئی۔ قانون کے مطابق یہ اقدام "معاشرتی ہم آہنگی" کے لیے ضروری تھا، لیکن یہ وضاحت نہیں کی گئی کہ آیا کسی دوسرے مذہب کی مخصوص علامات یا ثقافتی لباس پر بھی یہی قانون لاگو ہوگا یا نہیں۔ آسٹریا کی وزارتِ داخلہ نے اس قانون کا دفاع کرتے ہوئے کہا:

"We want to preserve our open society, and the full-face veil contradicts our vision of integration[2]".

یہ موقف اس فکری زاویے کو آشکار کرتا ہے کہ اسلامی ظاہری شعائر کو "غیر ہم آہنگ"، "خطرناک" یا "اجنبی" قرار دینا مغرب میں ایک عمومی طرزِ فکر بنتا جارہا ہے۔ لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ مغربی ریاستوں میں قانون سازی ایک ایسا آلہ بن چکی ہے جس کے ذریعے اسلام کو عوامی دائرے سے نکال کر پرائیویٹ دائرے تک محدود کیا جارہا ہے۔ کینیڈا کے صوبے کیوبیک میں 2019 میں "Bill 21" منظور ہوا، جو تمام سرکاری ملازمین پر مذہبی علامات پہننے کی پابندی عائد کرتا ہے۔ یہ قانون بھی بظاہر تمام مذاہب کے لیے ہے، لیکن عملاً صرف مسلم خواتین اس کا ہدف بنیں۔ ہیومن رائٹس واچ نے اس قانون پر تنقید کرتے ہوئے کہا:

"Bill 21 is discriminatory in both intention and effect, as it disproportionately affects Muslim women and undermines their access to employment[3]".

مذکورہ اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ قوانین مذہبی آزادی کے خلاف ہیں، اور شہری مساوات کو مذہبی شناخت کی بنیاد پر تقسیم کرتے ہیں۔ اور مندرجہ بالا گفتگو سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایسے قوانین مسلمان شہریوں کو روزگار، تعلیم اور سماجی وقار سے دور کرنے کا باعث بنتے ہیں۔

اسی ضمن میں بھارت کی صورت حال نہایت سنجیدہ ہے۔ بھارتیہ جنتا پارٹی (BJP) کی قیادت میں نافذ ہونے والے قوانین جیسے "Citizenship Amendment Act 2019" اور "National Register of Citizens (NRC)" مسلمان اقلیت کو عملاً شہریت کے حق سے محروم کرنے کی سازش بن چکے ہیں۔ بین الاقوامی جریدہ Foreign Affairs نے لکھا:

"The Indian government is codifying anti-Muslim bigotry into law, threatening the secular foundations of the republic[4]".

لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ اسلاموفوبیا اب صرف ثقافتی یا سماجی فوبیا نہیں بلکہ ایک ریاستی پالیسی، قانونی ڈھانچے اور تہذیبی نظریے کی شکل اختیار کر چکا ہے، جس کے ذریعے مسلمانوں کو مکمل شہری حیثیت سے محروم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

پارلیمانی بیانات، انتخابی مہمات اور سیاسی منشورات میں اسلاموفوبیا کی تنظیمی ساخت

اسلاموفوبیا کا جو رجحان پہلے عوامی رویّوں یا انفرادی تعصبات میں دکھائی دیتا تھا، وہ اب مغرب کے سیاسی اداروں، پارلیمانی مباحث، اور انتخابی منشورات میں کھلم کھلا اپنی جگہ بنا چکا ہے۔ اس کی سب سے سنگین شکل یہ ہے کہ بعض ریاستی ادارے اور سیاسی جماعتیں اب اسلاموفوبیا کو "ووٹر اپیل" کی حکمتِ عملی کے طور پر استعمال کرنے لگی ہیں۔ مسلمان اقلیتوں کو "دوسرے"، "خطرہ"، "انضمام سے نااہل"، یا "ملکی تشخص کے منافی" کے طور پر پیش کرنا اب محض تعصب نہیں بلکہ باقاعدہ سیاسی بیانیہ بن چکا ہے۔ برطانوی Conservative پارٹی کے سابق رہنما بورس جانسن نے 2018 میں The Telegraph میں لکھا تھا کہ برقعہ پہننے والی مسلمان خواتین "لیٹر باکس" یا "بینک ڈاکو" جیسی لگتی ہیں۔ ان کی اس تحریر پر نہ صرف کوئی پارٹی تادیب سامنے نہیں آئی بلکہ یہ بیانیہ اُن کے سیاسی قد کو بڑھانے کا ذریعہ بنا۔ The Guardian اخبار نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

"Johnson's remarks were not simply insensitive; they were calculated dog-whistles aimed at a political base increasingly sympathetic to anti-Muslim sentiment[5]".

"بورس جانسن کے تبصرے صرف غیر حساس نہیں تھے، بلکہ ایک سوچی سمجھی سیاسی چال تھی جو ایسے ووٹرز کو لبھانے کے لیے تھی جو اسلام مخالف جذبات سے ہم آہنگ ہیں۔"

لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ سیاست دانوں کے بیانات صرف نجی رائے کا اظہار نہیں رہے بلکہ یہ اسلاموفوبیا کو سیاسی شہرت، ووٹ بنک اور نظریاتی برتری کے لیے باقاعدہ ہتھیار کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔ یہ صورتحال مغربی جمہوریت کے اس تضاد کو ظاہر کرتی ہے جہاں ایک طرف "انسانی حقوق" کی دہائی دی جاتی ہے، مگر دوسری طرف مسلمانوں کو شعوری طور پر بدنام کر کے انتخابی مقاصد حاصل کیے جاتے ہیں۔ اسی طرزِ عمل کا ایک شدید مظہر جرمنی کی انتہائی دائیں بازو کی جماعت Alternative für Deutschland (AfD) کی سیاست میں نظر آتا ہے۔ 2017 کے وفاقی انتخابات میں ان کا منشور تھا:

"Islam does not belong to Germany. We oppose the construction of minarets and the call to prayer in public spaces[6]".

"اسلام جرمنی کا حصہ نہیں ہے۔ ہم مناروں کی تعمیر اور عوامی مقامات پر اذان کے خلاف ہیں۔"

مذکورہ بیان اس حقیقت کو عیاں کرتا ہے کہ مذہبی رسومات، عبادات، اور شناختی علامات اب صرف سماجی مسئلہ نہیں بلکہ سیاسی منشور کا مرکز بن چکی ہیں۔ جب اذان اور منارے، جو کسی قوم کے مذہبی و ثقافتی تشخص کی علامت ہیں، عوامی فضا میں ناپسندیدہ قرار دیے جائیں، تو یہ اس امر کی علامت ہے کہ ریاستی سطح پر اسلامی شناخت کو ختم کرنے کی سوچ جڑ پکڑ چکی ہے۔

فرانس میں Rassemblement National پارٹی، جس کی قیادت Marine Le Pen کے پاس ہے، نے 2022 کے انتخابات میں یہ اعلان کیا کہ وہ اگر برسرِ اقتدار آئیں تو "اسلامی عوامی مظاہر پر پابندی لگائیں گے"، جس میں حلال گوشت کی فراہمی، اسکارف، اور نماز کے لیے عوامی جگہوں کے استعمال کو شامل کیا گیا۔ Reuters کی رپورٹ کے مطابق:

"Le Pen proposed banning Muslim headscarves in all public spaces, describing it as a sign of 'Islamist submission[7]".'

"لی پین نے عوامی مقامات میں حجاب پر مکمل پابندی کی تجویز دی، اور اسے 'اسلامی غلامی کی علامت' قرار دیا۔"

اس تناظر میں واضح ہوتا ہے کہ سیاسی بیانیہ اب مذہب کے بیرونی اظہار کو "سیکیورٹی رسک" اور "سماجی علیحدگی" کے طور پر پیش کر رہا ہے، اور اس عمل کو قانونی تحفظ بھی حاصل ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر فرخ سلیم اپنی کتاب اسلام اور مغربی سیاست کا تصادم میں لکھتے ہیں:

"مغربی سیاستدان اسلاموفوبیا کو ایک نئے سیاسی ہتھیار کے طور پر استعمال کر رہے ہیں، جس کے ذریعے وہ نہ صرف ووٹر جذبات کو ابھارتے ہیں بلکہ اسلامی تہذیب کے خلاف ایک تہذیبی محاذ بھی قائم کرتے ہیں۔"[8]

لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ اسلاموفوبیا اب صرف خوف کا مظہر نہیں رہا بلکہ ایک نظریاتی جنگ کا مرکزی ستون بن چکا ہے، جس کے ذریعے مسلمان شناخت کو حاشیے پر دھکیلنے اور یورپی معاشرت میں غیر ضروری قرار دینے کی منظم کوشش ہو رہی ہے۔

امریکہ میں 2016 کے انتخابات کے دوران سابق صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے باقاعدہ وعدہ کیا تھا کہ وہ مسلمانوں کے امریکہ میں داخلے پر پابندی لگائیں گے۔ انہوں نے یہ وعدہ پورا کرتے ہوئے Executive Order 13769 پر دستخط کیے، جسے "Muslim Ban" کہا گیا۔ ACLU (American Civil Liberties Union) نے اس اقدام کو ایک خطرناک نظیر قرار دیا:

"This executive order legitimizes anti-Muslim discrimination in the name of national security[9]".

"یہ صدارتی حکم نامہ قومی سلامتی کے نام پر اسلام مخالف امتیاز کو قانونی جواز فراہم کرتا ہے۔"

یہ تمام مثالیں اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ اسلاموفوبیا اب سیاسی جماعتوں کے منشورات، انتخابی زبان، اور قانونی دائرہ کار کا ایسا حصہ بن چکا ہے کہ جو نہ صرف اسلام کے عالمی تشخص کو مسخ کرتا ہے بلکہ مغربی سیاست کے "جمہوری" دعوے کو بھی مشکوک بنا دیتا ہے۔ مندرجہ بالا گفتگو سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ جب سیاسی پارٹیاں مذہب کو نشانہ بنا کر ووٹ حاصل کرتی ہیں تو وہ محض مسلمانوں کے خلاف نفرت نہیں پھیلا رہیں، بلکہ جمہوریت، آزادی، اور شہری برابری جیسے اصولوں کی بنیاد کو کھوکھلا کر رہی ہیں۔

قومی سلامتی اور انسدادِ دہشت گردی:

اسلاموفوبیا کی معاصر اور خطرناک ترین شکل "قومی سلامتی" کے نظریے کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ نائن الیون کے بعد مغربی دنیا میں یہ نظریہ نہ صرف مقبول ہوا بلکہ اسے قانون سازی، عوامی پالیسی، پولیسنگ، انٹیلیجنس اور تعلیمی نظام تک پھیلا دیا گیا۔ "انسدادِ دہشت گردی" کی اصطلاح بظاہر غیر جانبدار اور عالمی امن کی نمائندہ دکھائی دیتی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے دائرۂ عمل میں زیادہ تر مسلمان اقلیتیں، اسلامی شعائر، اور مذہبی سرگرمیاں آتی ہیں۔ اس کے تحت ایسا قانونی ڈھانچہ قائم کیا گیا ہے جو صرف مسلمان شناخت کو نگرانی، شبہ، اور خاموش سزا کا نشانہ بناتا ہے۔

برطانیہ میں 2015 میں نافذ ہونے والی Prevent Duty Guidance ایک ایسی پالیسی ہے جس کے ذریعے تعلیمی ادارے، سرکاری دفاتر، اور صحت کے مراکز کو اس بات کا پابند بنایا گیا کہ وہ کسی بھی ایسے فرد یا سرگرمی

کی رپورٹ کریں جو "انتہاپسندی کی علامت" ہو۔ لیکن ان اصطلاحات کی تعریف اتنی مبہم ہے کہ حجاب پہننا، جمعہ کی نماز کے لیے چھٹی لینا، یا فلسطین سے ہمدردی ظاہر کرنا بھی "ریڈ فلیگ" بن جاتا ہے۔

Open Society Foundations کی ایک تحقیق میں یہ انکشاف کیا گیا کہ:

"Prevent disproportionately targets Muslim communities, creating a climate of fear, mistrust, and self-censorship among British Muslims[10]".

"پریوینٹ پالیسی غیر متناسب طور پر مسلم کمیونٹی کو نشانہ بناتی ہے، جس کے نتیجے میں برطانیہ کے مسلمانوں میں خوف، بے اعتمادی، اور خود پر سنسر شپ کی فضا پیدا ہوگئی ہے۔"

لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ قومی سلامتی کے نام پر بننے والی یہ پالیسیاں نہ صرف تعلیمی، مذہبی اور خاندانی فضا کو متاثر کرتی ہیں، بلکہ ایک پوری نسل کو اپنی شناخت چھپانے، رائے ظاہر نہ کرنے، اور شعوری طور پر "غیر مرئی" بننے پر مجبور کرتی ہیں۔ اس عمل کو اگر سیاسی نظروں سے دیکھا جائے تو یہ آزادیٔ رائے، عقیدہ، اور اجتماع کی بنیادی جمہوری قدروں کی نفی ہے۔

امریکہ میں USA Patriot Act 2001 نے جس قانونی اختیار کو جنم دیا محض دہشت گردی کے انسداد تک محدود نہ رہا۔ اس قانون کے تحت مسلمان تنظیموں، مدارس، مساجد حتیٰ کہ خیراتی اداروں پر بھی نگرانی، خفیہ کارروائیاں، اور مالیاتی معطلی مسلط کی گئی۔ ACLU کی رپورٹ کے مطابق:

"The Patriot Act allowed for unprecedented surveillance of Muslim Americans, often without probable cause or judicial oversight[11]".

"پیٹریاٹ ایکٹ نے مسلم امریکیوں پر بے مثال نگرانی کی اجازت دی، اکثر بغیر کسی معقول شبے یا عدالتی نگرانی کے۔"

مذکورہ تفصیل سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ قومی سلامتی کے نام پر مسلم شناخت کو مشتبہ، غیر یقینی اور فطری طور پر خطرناک تصور کر لیا گیا ہے، اور اسے ہر وقت جائزے، کنٹرول اور "اصلاح" کے دائرے میں رکھا گیا ہے۔ فرانس میں بھی Surveillance Law 2015 کے تحت حکومت کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ کسی بھی "ممکنہ خطرے" کی بنیاد پر فون کالز، ای میل، اور آن لائن مواد کی نگرانی کر سکتی ہے۔ Privacy International کی تحقیق میں لکھا گیا:

"France's surveillance laws grant disproportionate powers that are used overwhelmingly against Muslim communities and organizations[12]".

"فرانس کے نگرانی سے متعلق قوانین حکومت کو غیر متناسب اختیارات دیتے ہیں جو بڑی حد تک مسلم برادریوں اور تنظیموں کے خلاف استعمال ہوتے ہیں۔"

لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ مغربی ریاستوں میں سیکورٹی ڈھانچے نے ایک ایسا فکری سانچہ قائم کر لیا ہے جہاں مذہبی شعائر کو مشتبہ، ثقافتی شناخت کو غیر محفوظ، اور اجتماعی سرگرمی کو باغیانہ سمجھا جاتا ہے۔

ڈاکٹر جاوید اقبال صدیقی اپنی کتاب اسلامی شناخت اور مغربی خوف میں لکھتے ہیں:

"مسلمانوں پر نگرانی اور ان کی سرگرمیوں کو ریڈ زون قرار دینے کا عمل، درحقیقت جدید مغرب کے اندر ایک تہذیبی عدم تحفظ کا اظہار ہے، جو اسلام کو ایک نظریاتی متبادل کے طور پر دیکھتا ہے۔"[13]

یہ نکتہ اس حقیقت کو بے نقاب کرتا ہے کہ مغرب کا مسلم شناخت سے خوف صرف سلامتی کا معاملہ نہیں بلکہ تہذیبی خود اعتمادی کے فقدان کا نتیجہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ریاستیں اسلامی شناخت کو محض مذہبی مظہر کے طور پر نہیں بلکہ ایک تہذیبی چیلنج کے طور پر دیکھتی ہیں — اور اسی چیلنج کو "قومی سلامتی" کے پردے میں دبا دینے کی کوشش کرتی ہیں۔

اسلاموفوبیا پر مبنی قانون سازی کے نفسیاتی و عمرانیاتی اثرات:

جب قانون سازی کسی مذہب، قوم یا ثقافتی گروہ کے خلاف تعصب پر مبنی ہو، تو اس کے اثرات صرف قانونی دائرے تک محدود نہیں رہتے، بلکہ وہ انفرادی نفسیات، سماجی رویوں، تعلیمی ترجیحات، اور طرزِ فکر تک کو متاثر کرتے ہیں۔ مغربی معاشروں میں اسلاموفوبیا پر مبنی قوانین اور پالیسیوں نے ایک ایسا فضا تشکیل دی ہے جس میں مسلم نوجوان نہ صرف شناخت کے بحران کا شکار ہو رہے ہیں بلکہ وہ تعلیم، روزگار اور سماجی انضمام کے امکانات سے بھی محروم ہوتے جا رہے ہیں۔ مذہبی شعائر کے اظہار، خاندان سے وابستگی، اور تہذیبی شعور کو مغربی ریاستی بیانیے میں خطرے کی علامت قرار دے دیا گیا ہے، جس کا براہِ راست اثر مسلمان نوجوانوں کی ذہنی صحت، خود اعتمادی، اور سماجی کردار پر پڑتا ہے۔

مغربی محقق Farid Hafez، جو آسٹریا میں European Islamophobia Report کے مدیر بھی ہیں، اپنی تحقیق میں رقم کرتے ہیں:

"Islamophobic policies create an environment in which Muslim youth are alienated from mainstream society and begin to experience themselves as outsiders[14]".

"اسلاموفوبک پالیسیز ایک ایسا ماحول پیدا کرتی ہیں جس میں مسلمان نوجوان مرکزی معاشرے سے علیحدہ ہو جاتے ہیں اور اپنے آپ کو اجنبی کے طور پر محسوس کرنے لگتے ہیں۔"

لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ ان پالیسیوں کا سب سے پہلا اور شدید اثر یہ ہے کہ مسلم نوجوان اپنی شناخت سے لاتعلقی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ وہ یا تو مذہب کو "خطرے" کے طور پر دیکھنے لگتے ہیں، یا اس کے اظہار سے گریز کرنے لگتے ہیں۔ حجاب پہننے والی طالبات، سنت رکھنے والے نوجوان، یا اسلامی موضوعات پر دلچسپی رکھنے والے طلبہ اکثر "ریڈ فلیگ" بن جاتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ تعلیمی اداروں میں سماجی نفرت، اساتذہ کے مشتبہ رویوں، اور ہم جماعتوں کی تنقید کا سامنا کرتے ہیں۔ برطانوی تھنک ٹینک Runnymede Trust کی 2017 کی رپورٹ "Islamophobia: Still a Challenge for Us All" میں اس پر تبصرہ موجود ہے:

"Muslim students report higher levels of anxiety, isolation, and academic underperformance in institutions where Islamophobia is prevalent[15]".

"مسلم طلبہ اُن اداروں میں زیادہ اضطراب، تنہائی، اور تعلیمی ناکامی کی شکایت کرتے ہیں جہاں اسلاموفوبیا غالب ہو۔"

مذکورہ تفصیل سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ تعلیمی ادارے جہاں شعور، تحقیق اور امن کی بنیادیں رکھی جاتی ہیں، وہی ادارے اگر مسلم شناخت کو مشکوک قرار دینے لگیں تو نوجوان نسل علمی ترقی کے بجائے ذہنی تنزلی کا شکار ہو جاتی ہے۔ ایسے نوجوان نہ صرف تعلیم سے بدظن ہوتے ہیں بلکہ وہ معاشرے کے ساتھ ربط کھو بیٹھتے ہیں، اور یہی تنہائی مستقبل میں جذباتی ٹوٹ پھوٹ یا انتقامی نفسیات کو جنم دیتی ہے۔

ڈاکٹر رضوان خالد اپنی تصنیف اسلامی شعائر اور شناختی بحران میں اس نکتہ کو یوں واضح کرتے ہیں:

"جب مسلم نوجوان کو اس کی شناخت پر شک کی نگاہ سے دیکھا جائے، تو وہ یا تو اس شناخت کو ترک کرتا ہے یا اس پر خفیہ طور پر عمل کرتا ہے۔ دونوں صورتیں ذہنی اضطراب، جذباتی بغاوت اور فکری تضاد کو جنم دیتی ہیں۔"[16]

لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان نوجوان اب دو انتہاؤں کے درمیان زندہ ہیں: ایک طرف مکمل انضمام (assimilation) کے دباؤ کے تحت شناخت سے دستبرداری، اور دوسری طرف "ردعمل کی شناخت" (reactive identity) کے تحت شدت پسندی۔ ان دونوں کیفیتوں کی جڑ وہی قانون سازی ہے جو آزادئ مذہب اور مساوی شہری حقوق کے دعوے کے باوجود مسلمان نوجوان کو دفاعی پوزیشن پر لے آتی ہے۔

اس سے متعلق Shamim Miah نے اپنی تحقیق میں بجا طور پر نشاندہی کی کہ:

"British Muslim youth often develop a hybrid identity, where they negotiate between state surveillance and cultural loyalty, leading to cognitive dissonance and sociopolitical alienation[17]".

"برطانوی مسلمان نوجوان اکثر ایک مخلوط شناخت اختیار کرتے ہیں، جہاں وہ ریاستی نگرانی اور ثقافتی وفاداری کے درمیان توازن قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جس کا نتیجہ ذہنی تناؤ اور سماجی و سیاسی علیحدگی کی صورت میں نکلتا ہے۔"

یہ بیان اس حقیقت کی ترجمانی کرتا ہے کہ جب ریاستی قانون، میڈیا، اور عوامی بیانیہ مسلسل نوجوان مسلمان کو مشکوک بناتے ہیں، تو وہ شعوری یا لاشعوری طور پر اپنی اسلامی شناخت کو "مسئلہ" سمجھنے لگتا ہے، اور یوں ایک نفسیاتی دفاعی کیفیت میں جینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تعلیم، جدت، اور معاشرتی خدمت کے تمام دروازے اُس کے لیے یا تو بند ہو جاتے ہیں یا مشروط کر دیے جاتے ہیں۔

اسلاموفوبیا پر مبنی قانون سازی کے سماجی اثرات میں خوف، شناخت کا بحران، خود پر الزام، اور معاشرتی اجنبیت جیسے نتائج اب مسلم اقلیتوں کا روزمرہ تجربہ بن چکے ہیں۔ حجاب، سنت، نماز، قرآن کی تعلیم، اور مسجد کی حاضری جیسی اسلامی علامتیں اب مغرب میں صرف مذہبی افعال نہیں رہیں، بلکہ وہ قانون، میڈیا اور سیاست کی نظر میں "اشتباہ" کا نشان بن چکی ہیں۔[18]

چنانچہ مسلمانوں کو اپنی روزمرہ زندگی میں قدم قدم پر اپنے دین کی "صفائی" دینی پڑتی ہے۔ ان ریاستی رویوں نے مسلم اقلیتوں کو جمہوری اداروں سے اعتماد کے فقدان، تعلیم و روزگار میں رکاوٹ، اور سیاسی عمل سے بیگانگی کی طرف دھکیلا ہے۔ خصوصاً نوجوان نسل جو مغربی معاشروں میں پیدا اور پروان چڑھی، وہ اب اس کشمکش میں مبتلا ہے کہ آیا وہ اپنی دینی شناخت برقرار رکھے یا سماجی قبولیت حاصل کرے۔ ان میں جو اپنی شناخت کے ساتھ جُڑے رہنے کی کوشش کرتے ہیں، انہیں نگرانی، مشتبہ فہرستوں، اور غیر مرئی امتیاز کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جبکہ جو نوجوان "اپنے آپ سے کٹ کر" انضمام کا راستہ اپناتے ہیں، وہ فکری خلا، جذباتی بے سکونی، اور نظریاتی پسماندگی میں گھر جاتے ہیں۔ اسی تسلسل میں ایک دوسرا گہرا مسئلہ قانون کی زبان ہے۔ جس طرح "امن"، "رواداری"، "سیکورٹی"، "جمہوریت" اور "تہذیبی ہم آہنگی" جیسے الفاظ استعمال کیے جا رہے ہیں، وہ درحقیقت اسلام کو عوامی زندگی سے بے دخل کرنے کا جمالیاتی اسلوب بن چکا ہے۔ یہ الفاظ بظاہر مثبت ہیں، مگر ان کا مفہوم مسلمان شہریوں کے لیے قید، سنسر، اور امتیاز بن جاتا ہے۔ لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ مغرب میں قانون اب صرف انصاف کی علامت نہیں بلکہ تہذیبی طاقت کا آلہ بن چکا ہے۔

اسلامی دنیا کے لیے یہ صورتحال ایک سنگین انتباہ ہے۔ اگر مسلم ریاستیں، ادارے اور مفکرین اس خطرے کا منظم اور فکری جواب نہیں دیتے تو یہ صرف شناخت کا زوال نہیں، بلکہ اسلام کے عالمی وجود کی سماجی تحلیل کا آغاز ہوگا۔ اس کے تدارک کے لیے صرف مذمتی بیانات، وقتی بائیکاٹ یا سوشل میڈیا پر احتجاج کافی نہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان قانون، سیاست، ابلاغ اور تعلیم کے میدانوں میں نہ صرف مؤثر نمائندگی حاصل کریں بلکہ ایک متبادل اخلاقی، قانونی اور تہذیبی بیانیہ تشکیل دیں جو اسلام کو محض مظلوم نہ دکھائے، بلکہ ایک عالمی مہذب قوت کے طور پر منوائے۔

نتیجہ:

ریاستی پالیسیوں میں اسلاموفوبیا کا نفوذ ایک پیچیدہ اور گہرا مسئلہ ہے جس نے نہ صرف مسلمانوں کی شناخت بلکہ ان کی سیاسی، سماجی اور ثقافتی حیثیت کو متاثر کیا ہے۔ اس تحقیق سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مغربی ریاستوں میں اسلامی شناخت کو خطرے کی علامت کے طور پر پیش کر کے ریاستی اداروں میں امتیازی پالیسیاں مرتب کی گئی ہیں۔ نائن الیون کے بعد کے عرصے میں قومی سلامتی اور انسدادِ دہشت گردی کے بیانیے کے تحت مسلمانوں کو مشتبہ، غیر محفوظ اور اجنبی کے طور پر پیش کیا گیا، جس کے نتیجے میں ان پر تشویش کی نگاہ رکھی گئی اور ان کے حقوق میں کمی کی گئی۔

قانون سازی میں اسلاموفوبیا کی سرایت نے مذہبی امتیاز کو جواز بخشا اور مسلمانوں کے لیے ایک غیر مساوی قانونی فریم ورک تیار کیا۔ سیاسی بیانات اور انتخابی منشورات میں اسلاموفوبیا کو باقاعدہ طور پر استعمال کیا گیا تاکہ عوامی حمایت حاصل کی جاسکے اور سیاسی فائدہ اٹھایا جاسکے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی واضح ہوا کہ ریاستی سطح پر کیے گئے ان اقدامات کا نفسیاتی اور عمرانیاتی اثرات مسلمانوں کی ذہنی صحت، سیاسی شمولیت اور سماجی تعلقات پر منفی انداز میں مرتب ہوئے ہیں۔

اس تحقیق کا مقصد یہ ہے کہ ہم ریاستی اسلاموفوبیا کو صرف ایک فردی مسئلہ نہ سمجھیں، بلکہ اسے ایک مربوط سیاسی، سماجی اور نظریاتی رجحان کے طور پر دیکھیں۔ جب ریاستی ادارے مذہبی امتیاز کو فروغ دیتے ہیں تو وہ نہ صرف جمہوری اصولوں اور انسانی حقوق کو پامال کرتے ہیں بلکہ ایک بے حد تقسیم شدہ اور متنازع معاشرہ تشکیل دیتے ہیں۔ اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ عالمی سطح پر انسان دوستی، برابری اور رواداری پر مبنی پالیسیوں کی تشکیل کی جائے، جس میں مسلمانوں کو مکمل طور پر شامل کیا جائے اور ان کے حقوق کی حفاظت کی جائے۔

مزید تحقیق کے امکانات:

آنے والے تحقیقاتی کاموں کو ریاستی اسلاموفوبیا کی نوعیت کو مزید گہرائی سے سمجھنے کے لیے نئے زاویوں سے دیکھنا ہوگا۔ مستقبل میں یہ تحقیق کی جاسکتی ہے کہ کس طرح مختلف جغرافیائی اور ثقافتی سیاق و سباق میں اسلاموفوبیا کی ریاستی پالیسیوں میں سرایت کا فرق آتا ہے، اور ان ریاستوں میں مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے لیے کون سے مؤثر حکمت عملیاں اپنائی جاسکتی ہیں۔ مزید برآں، سوشل میڈیا اور ڈیجیٹل پلیٹ فارمز کی بڑھتی ہوئی اہمیت کے پیش نظر، ان پلیٹ فارمز پر ریاستی اسلاموفوبیا کے اثرات اور اس کے خلاف اٹھائے جانے والے اقدامات پر تحقیق کی جاسکتی ہے۔ اس کے علاوہ، ریاستی اسلاموفوبیا کے نفسیاتی اثرات اور مسلمانوں کی معاشی، سیاسی اور سماجی ترقی پر ان کے اثرات کو مزید تفصیل سے جانچنا ایک اہم تحقیقی میدان بن سکتا ہے۔

حوالہ جات

[1] European Court of Human Rights, S.A.S. v. France, Judgment of 1 July 2014, Application no. 43835/11

[2] Austrian Federal Chancellery, Press Statement, 2017

[3] Human Rights Watch, Canada: Quebec Religious Symbols Law Discriminates, 2020

[4] Foreign Affairs, India's Democracy at Risk, Vol. 99, No. 3, May/June 2020

[5] The Guardian, Boris Johnson's Islamophobia, August 2018

[6] AfD Party Program, 2017, Berlin: Bundeswahlleiter

[7] Reuters, Le Pen Proposes Public Hijab Ban, April 2022

[8] فرخ سلیم، اسلام اور مغربی سیاست کا تصادم، لاہور: مرکز علم و آگہی، 2021، ص89

[9] ACLU, Legal Challenge to Trump's Muslim Ban, 2017

[10] Open Society Foundations, Eroding Trust: The UK's Prevent Counter-Extremism Strategy, London: OSF, 2016, 8

[11] ACLU, The Impact of the Patriot Act on Civil Liberties, Washington, D.C.: ACLU, 2015, 4

[12] Privacy International, State Surveillance in France, Paris: PI Publications, 2017, 9

[13] جاوید اقبال صدیقی، اسلامی شناخت اور مغربی خوف، اسلام آباد: ادارہ بینات، 2022، ص114

[14] Farid Hafez, European Islamophobia Report 2020, Istanbul: SETA Foundation, 2021, 18

[15] Runnymede Trust, Islamophobia: Still a Challenge for Us All, London: Runnymede, 2017, 34

[16] رضوان خالد، اسلامی شعائر اور شناختی بحران، لاہور: دارالعلم، 2020، ص97

[17] Shamim Miah, Muslim Youth, Identity and Politics, London: Palgrave Macmillan, 2016, 55

[18] ندوی، سلیمان، اسلام اور مغرب: تہذیبی کشمکش کا فکری تجزیہ. لاہور: دارالاشاعت، 2016، ص241